میرؔ کی عشقیہ مثنویاں- ایک جائزہ

ڈاکٹر سبینہ اویس اعوان[1]م ڈاکٹر محمد افضال بٹ**

Abstract:

"Mir Taqi Mir was considered one of the greatest poet of Urdu literature. He was also called the god of the literature. Although he was renowned as "Ghazal Gho" but he also showed his talent in other geners of Urdu literature. He was also known as a great name in Urdu NASR. His critical and research based reviews are also the part of ancient libraries. Tazkara, Shehre Ashob, Ghazal, Musalas, Mukhammas, Rubayyat, Fardyaat, Naat, Manqabat and Masanviat are included in his literary collections. However, Urdu Masnavi was in lower cadre in Mir's era despite that fact, Mir wrote in this cadre. Mir described romantic stories of his time in a poetic way in Masnavi's form in an attractive way. His romantic Masnavis not only prove helpful in understanding Mir's personality but also have great importance in Urdu literature. In his romantic poems, Mir described Ishq in a very open and realistic methodology and shed high light life's real purpose. By studying these Masnavis, one can easily understand the real role of Ishq, love and affection in the creation and continuity of this universe. Such concepts were elaborated poetically in Mir's Masnavis. This article will shed light on Mir's writings and present interpretation of his concepts."

Keywords: Universe, Creation, Affection, Realistic Methodology, Romantic Masnavis, Cadre, Supernatural Elements, Sufism, Art & Culture, A Reflection of Spirit of Age.

کلیدی الفاظ: خدائے سخن، تصورِ عشق، شخصی جذبات، روحِ عصر کی عکاسی، مافوق الفطرت عناصر، تہذیب و ثقافت، تصوف۔

میرؔ تقی میرؔ ایک ہمہ جہت شخص اور شاعر تھے ان کی تخلیقی فعالیت اور شاعرانہ عظمت کے سبھی معترف ہیں بلا شبہ انھیں خدائے سخن تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے تذکرہ نکات الشعرا کو اردو کا اوّلین تذکرہ قرار دیا جانا ہے یہ تذکرہ اردو میں تحقیق و تنقید کی روایت ٹھہرتا ہے اس طرح ان کا رسالہ فیض میرؔ بھی قابلِ ذکر ہے۔ علاوہ ازیں ان کی عشقیہ، واقعاتی، ہجویہ اور مدحیہ مثنویاں بھی میرؔ کے کمالِ فن کی عکاس ہیں۔

دنیا بھر کی زبانوں کے ادب و شاعری میں عشق کا موضوع اہمیت کا حامل ہے اور کیوں نہ ہو کہ انسانی جذبوں اور رشتوں میں جذبۂ عشق سے انوکھا اور البیلا جذبہ کوئی اور ہے ہی نہیں بل کہ بعض اوقات تو یہ پوری انسانی شخصیت کا اشاریہ بن جاتا ہے۔ عشق سے ہی تو انسان کی شناخت ہے اور عشق ہی تو انسان کی پوری زندگی پر اثرانداز ہو کر اس کی علامت بن جاتا ہے۔

میرؔ غزل کے شاعر ہیں اور غزل کی شاعری بنیادی طور پر حُسن و عشق کی شاعری ہوتی ہے۔ موضوع سے الگ بھی دیگر اصنافِ سخن مثلاً مثنوی میں بھی اسی عشق کا بیان ملتا ہے۔ میرؔ تقی میرؔ ایک غزل گو شاعر ہیں لیکن انھوں نے مثنویاں بھی لکھیں اور اعلیٰ پایے کی مثنویاں تحریر کیں۔ اگرچہ میرؔ سے قبل بھی دکنی شعرا نے عشقیہ قصے اپنی مثنویوں میں بیان کیے لیکن ان عشقیہ مثنویوں کا طرزِ بیان اور زبان میں نامانوسیت ہے میرؔ کی مثنویوں میں بھی چند نقائص پائے جاتے ہیں لیکن انھوں

---

[1]اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج وومن یونی ورسٹی ، سیال کوٹ
** چیئرپرسن شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج وومن یونی ورسٹی ، سیال کوٹ

نے اپنے محدود دائرے میں مثنوی کے فن کو ترقی دی۔ اس میں دل کش اضافے کیے۔ انھوں نے مثنوی کے فن کو سچے اور عشقیہ جذبوں سے بھی روشناس کروایا اور پُرخلوص واقعیت کا سہارا لیتے ہوئے مثنوی کو بھی غزل کی طرح شخصی جذبات کا ذریعۂ اظہار بنایا۔ ''کلیاتِ میرؔ'' میں بعض مثنویاں اتنی مختصر ہیں کہ ان کو مختصر واقعاتی نظمیں بھی کہا جا سکتا ہے البتہ قصہ کہانی پر مشتمل نظمیں نہ بہت مختصر ہیں نہ ہی بہت طویل۔ مثلاً اعجازِ عشق ۱۰۹۷، دریائے عشق ۲۶۶، شعلۂ عشق ۲۳۴، معاملاتِ عشق ۲۳۵، جوشِ عشق ۱۵۶، خواب و خیال ۱۲۹ اشعار پر مشتمل ہیں۔ میرؔ کی تخلیقات شعری کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ وہ عموماً غزل میں طویل کلام کی طرف مائل ہو جاتے ہیں لیکن مثنویات میں اختصار کو اپناتے ہیں۔ ان کے قصیدے بھی اتنے طویل نہیں جتنے سودا کے ہیں۔ بعض اوقات ان کی مختصر مثنویاں ان کی طویل غزلیات کے قریب جا پہنچتی ہیں۔ ان کی عام غزلیات میں بھی بعض اوقات مختصر مثنوی یا نظم کا تسلسل پایا جاتا ہے۔

مثنوی اردو ادب کی معروف صنفِ سخن ہے جو صنفی بوقلمونیوں کے باعث شاعری کی دیگر اصناف سے زیادہ وسعت کی حامل ہیں۔ اس میں انسانی جذبات، مناظرقدرت، واقعہ نگاری، اخلاق، فلسفہ، تصوف، ہجر و وصال، تہذیب و معاشرت، تخیل، عشق و محبّت، رنج و غم، غیظ و غضب غرض تمام جذبات کی تصویرکشی بآسانی کی جا سکتی ہے۔ مثنوی کے اشعار آپس میں یوں مربوط ہوتے ہیں جیسے زنجیر کی ایک کڑی دوسری کے ساتھ۔ برِّصغیر پاک و ہند کے علاقے دکن میں اردو مثنوی نے آنکھ کھولی۔ بیجاپور، گول کنڈہ، دہلی اور لکھنؤ میں بہت مثنویاں لکھی گئیں۔ جدید دور میں مثنوی کا رجحان نسبتاً کم ہو گیا۔ غزل اور نظم نے اپنی مقبولیت اور آفاقیت کے سبب اس صنفِ ادب کو غیرمقبول بنا دیا۔

مثنویاتِ میرؔ کا مطالعہ ان کے سوانحی حالات اور شخصیت کے عہد کے سیاسی و معاشی خلفشار کے پسِ منظر میں کرنا چاہیے۔ میرؔ ایک درویش کے بیٹے تھے اور بچپن سے سیّد امان اللہ، سیّد احسان اللہ جیسے درویشوں کے زیرِ اثر تربیت پائی۔ میرؔ سیّد امان اللہ کو چچا کہتے تھے اور انھیں کی صحبت پسند کرتے۔ صوفی باپ نے میرؔ کو اوائلِ عمری سے ہی عشق اختیا کرنے کی ہدایت کی۔ میرؔ کے مزاج میں ابتدا سے ہی برگشتگی تھی۔ لڑکپن کے لاابالی عہد میں بھی یہ کھوئے کھوئے سے، گہری سوچ میں مگن دکھائی دیتے۔ میرؔ کی عمر دس برس کی تھی ان کے منہ بولے چچا سیّد امان اللہ کے بعد ان کے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن نے میرؔ سے بڑی بے رُخی برتی جس کی وجہ سے میرؔ گھر چھوڑ کر دلی چلے گئے۔ دلی میں انھیں ایک حسینہ سے عشق ہوا۔ میرؔ اپنے سوتیلے ماموں خان آرزو کے پاس ٹھہرے۔ میرؔ کے بھائی محمد حسن نے خان آرزو کو خط لکھ کر بتایا کہ میرؔ فتنۂ روزگار ہے،ا س کے بعد خان آرزو نے میرؔ کے ساتھ بدسلوکی کو شیوہ بنا لیا۔ عزیزوں کے ظلم و ستم، محبوب کے ہجر نے میرؔ کی طبیعت میں جُنُون کی کیفیت پیدا کر دی جس کی تفصیل میرؔ کی مثنوی ''خواب و خیال'' میں موجود ہے۔ عشق میں ناکامی، روزبروز کی صعوبتوں، فاقہ کشی، اہلِ دنیا سے مایوسی، توکل اور استغنا نے انھیں کج خُلق اور بد دماغ بنا دیا۔ میرؔ کو ناقدری کا شکوہ بھی تھا جس کی وجہ سے وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ گھر کے اندر رہنے کی وجہ سے انھوں کے گھر کے اندر کی چیزوں اور پالتو جانوروں کا گہرا مشاہدہ کیا۔ چناں چہ ان کی کئی مثنویاں درونِ خانہ سے متعلق ہیں ان مثنویوں میں میرؔ کی سیرت کے تمام پہلو دکھائی دیتے ہیں۔

میرؔ کے سوانحی حالات سے عیاں ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں داخلی اور خارجی سطح پر انتشار رہا۔ وہ خارجی انتشار پر تو قابو نہ پا سکے کیوں کہ خارجی انتشار ان کی دست رس سے باہر تھا لیکن انھوں نے جذبے کی تنظیمِ نو کر کے اپنے داخلی انتشار پر بڑی ہنرمندی سے قابو پا کر اپنے احساسات اور جذبات کو تخلیقی اظہار میں منتقل کیا۔ میرؔ کی شاعری عشق کے تہذیبی تصور کو اعلیٰ انسانی قدر کے طور پر پیش کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ میرؔ کے ہاں عشق کے رجحانات بہت قوی ہیں جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو میرؔ کے والد نے انھیں نصیحت کی کہ:

''بیٹا عشق کرو، عشق ہی اس کارخانے میں متصرف ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو نظمِ کل قائم نہیں رہ

سکتا تھا۔ بے عشق زندگی وبال ہے۔ عشق میں جان کی بازی لگا دینا کمال ہے۔ عشق بناتا ہے۔ عشق ہی کُندن کر دیتا ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہے عشق کا ظہور ہے۔''(۱)

میرؔ کی ساری زندگی ان کا نظریۂ حیات اور شاعری کا مرکزی نقطہ یہی عشق کا تصور ہے جو انھیں ورثے میں ملا تھا۔ عشق ان کی شاعری کا بنیادی محرک ہے۔ میرؔ کی شاعری کا سوز و ساز، عشق ہی کا مرہونِ مِنّت ہے۔ انھوننے عشق کی جن ظاہر و پوشیدہ کرامات کا ذکر کیا وہ آگ کو گل و گلزار بنائے بغیر ممکن نہ تھا۔ آلامِ عشق کے باعث ہی وہ آلامِ زندگی سے نبرد آزما رہے۔

میرؔ کی عشقیہ مثنویوں کا محور تصورِ عشق، جذبۂ عشق بالخصوص عشق کا مجرد تصور ہے۔ میرؔ کے نزدیک عشق ہی زندگی کا حاصل ہے۔ عشق ہی اس کارخانۂ ہستی کا چلانے والا ہے۔ عشق کے بغیر زندگی وبال ہے۔ میرؔ کے والد علی متقی کے نزدیک اس زندگی کا حاصل عشق ہی ہے کائنات میں نظم و ضبط عشق ہی کی بدولت ہے۔ علی متقی کے نزدیک عشق کا مقام و مرتبہ، بندگی، زہد و عرفان، صداقت، اشتیاق اور وجدان سے بہت بلند ہے۔ میرؔ کے والد علی متقی کے افکار و خیالات کے نقوش ان کی شخصیت پر گہرے تھے۔ زندگی بھر میرؔ انہی اثرات کے زیرِ سایہ رہے۔ غرض میرؔ کے والد کی شخصیت میرؔ کے لیے ایک بڑا شعری محرک ثابت ہوئی۔

میرؔ کی مثنویوں میں غزلوں کی طرح عشق و محبّت کا تصور اُبھر کر سامنے آتا ہے اور ان کی ذہنی الجھنوں اور نفسیاتی کج رویوں کی مکمل عکاسی ان کی مثنویوں میں موجود ہے۔ میرؔ نے اپنی مثنویوں میں عشقیہ قصے بیان کیے۔ یہ مثنویاں میرؔ کی غزلوں کا وضاحتی اظہار ہیں۔ ان مثنویوں کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک مسلسل غزل میں ڈھل گئی ہیں۔ ہجر و فراق، غم و الم کے عناصر ان میں موجود ہیں۔ یہ وہی عناصر ہیں جو میرؔ کی غزل کے مزاج کا حصہ ہیں۔ میرؔ نے ان عشقیہ مثنویوں میں مثنوی کی عام ہیئت کو استعمال نہیں کیا۔ میرؔ کی عشقیہ مثنویاں سوائے ''اعجازِ عشق'' کے حمد، نعت، منقبت وغیرہ سے شروع نہیں ہوتیں بل کہ ابتدا میں وہ عشق کی تعریف و توصیف میں بہت سے اشعار پیش کر کے قارئین کو عشق کی ہمہ گیر صفات، زندگی اور کائنات میں اس کی اہمیت سے روشناس کرواتے ہیں۔ میرؔ کی مثنویوں میں عشق ایک بحرِ بےکنار ہے جو ساری زندگی پر حاوی ہے۔ میرؔ کی عشقیہ مثنویوں کے حوالے سے ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کی عشقیہ مثنویوں میں افسانوی دل چسپی نہیں۔ کردارنگاری کے شاہکار ہیں۔ ان کی واحد کائنات رودادِ عشق ہے اور اسی وجہ سے یہ مثنویاں آج بھی شاداب و تازہ ہیں۔ میرؔ کی عشقیہ مثنویوں میں جو چیز جاذبِ توجہ ہے وہ عشاق کا ماجرا نہیں بل کہ مجرد و مطلق عشق کا تصور ہے۔''(۲)

میرؔ کو قصے سے نہیں بل کہ اس مخصوص تصورِ عشق کو شعر کا جامہ پہنانے سے دل چسپی ہے۔ اگرچہ ان عشقیہ مثنویوں کے کردار بظاہر ناکام عاشق ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو مشرقی قصوں کے نام ور عاشق مثلاً مجنوں، فرہاد، رانجھا، پُنّوں، وامق وغیرہ ناکام عاشق تھے لیکن جذبِ عشق کے اظہار میں یکتائے روزگار تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرؔ کا عشق بھی انھیں عاشقوں میں سے ایک تھا۔ جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کی ان عشقیہ مثنویوں میں جس عشق کا اظہار ہوا ہے۔ یہ وہی تصورِ عشق ہے جو حیات بعد ممات پر پورا ایمان رکھتا ہے۔ یہی وہ عشق ہے جو ہمیں حضرت عیسیٰؑ کی صلیب میں، رسولِ خدا□ کے پیغام میں، منصور حلاج کے دار پر چڑھنے کے عمل میں، ابنِ العربی کے فلسفے میں، مولانا روم کی مثنوی میں، سعدی کی شاعری میں اور اقبال کی فکر میں نظر آتا ہے۔''(۳)

میرؔ کی عشقیہ مثنویوں میں تصورِ عشق مادی و روحانی، مجازی و حقیقی سطح پر مل کر ایک وحدت بن جاتا ہے۔ میرؔ کی مثنویوں کے کردار جذبات و مزاج کی سطح پر بہت مشترک ہیں آتشِ عشق بھڑکنے کے بعد زندگی اور موت ان کے لیے یکساں ہے۔ ان مرد کرداروں میں میرؔ کی شخصیت نظر آتی ہے۔ میرؔ کی عشقیہ مثنویوں کا ہیرو کبھی نوابوں اور بادشاہوں سے نہیں ہوتا بل کہ ہمیشہ طبقۂ عوام

سے ہوتا ہے۔ ان کا ہیرو مجنوں صفت، عشق میں فنا، فنا فی العشق، دنیا سے بے نیاز ہوتا ہے۔ داستانی مثنویوں کا ہیرو حُسن و شجاعت کے ساتھ ساتھ دنیادار اور مصلحت بیں ہوتا ہے لیکن میرؔ کی عشقیہ مثنویوں کا ہیرو وفادار ، مظلوم، جانباز عاشق ہے جس کی زندگی پر قارئین کو رحم آتا ہے۔ اور جس کی موت پر افسوس ہوتا ہے دیگر اردو داستانوں کا ہیرو ہر فن مولا ہوتا ہے لیکن میرؔ کا ہیرو صرف ایک فن میں طاق ہے اور وہ ہے شدت کے ساتھ عشق کرنا۔ غرض دنیا و مافیہا سے بےنیاز ہو کر وادیِ عشق میں قدم رکھنا پھر اسی کا اسیر ہو کر رہ جانا۔ میرؔ کے عاشق ہیرو کی مدد کے لیے کوئی پریاں نہیں آتیں بل کہ یہ ناکام عاشق عشق میں ہی اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کا دماغ قاتل کا نہیں بل کہ قتل ہونے والے کا دماغ ہے۔ اسی لیے اس میں سفاکی کے بجائے نرمی ہے۔ مقصد کی آگ اسے منزل کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ ذہن غزل کے روایتی انداز میں چھپا چھپا رہتا ہے لیکن مثنویوں میں کھل کر سامنے آتا ہے۔ اسی لیے میرؔ کے ذہن کو سمجھنے کے لیے ان کی عشقیہ مثنویوں کی خاص اہمیت ہے۔''(۴)

میرؔ کی عشقیہ مثنویاں داخلیت سے بھرپور ہیں۔ ان مثنویوں میں میرؔ نے اپنے کرداروں کی زبانی دروں خانہ دل کی باتیں کی ہیں۔ بل کہ میرؔ کی عشق کے متعلق جو حسرتیں تھیں ان کا واشگاف اظہار ملتا ہے۔ میرؔ کی مثنوی ''جوشِ عشق'' اور ''خواب و خیال'' ایک مجذوب غزل گو شاعر کی آپ بیتی معلوم ہوتی ہیں جس کے لیے غزل کے بجائے مثنوی کی وسعت تلاش کی گئی ہے اور وہی خیالات جو عموماً میرؔ کی غزلوں میں بیان ہوئے ہیں وہی خیالات ہیں جو غزل میں اجمال سے بیان ہوئے ہیں۔ یہاں بیانیہ کی صورت میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ میرؔ نے مثنویوں میں اپنی تہذیب، اپنے ماحول اور خارجی کائنات کی عکاسی عمدگی سے کی ہے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ ''نقدِ میرؔ'' میں لکھتے ہیں:

> ''..... میرؔ نے مثنوی میں مفرد اور بسیط تجربات کو بتفصیل بیان کیا اور اس طرح نظم گوئی اور قطعہ نگاری کے ذوق کو وسعت دی۔ ان وجوہ و اسباب کی بنا پر ادب اردو کا ہر مؤرّخ میرؔ کو مثنوی کے معماروں میں اہم جگہ دینے پر مجبور ہے۔''(۵)

اگرچہ میرؔ کا بنیادی حوالہ غزل ہے غزل ہی ان کی وجۂ شہرت ہے۔ میرؔ کی غزلوں میں موضوعات کا تنوع، خیالات کی ہمہ گیری، جذبات و احساسات، ذاتی تجربات و مشاہدات، دردمندی، اسلوب نے قارئین کو بہت متاثر کیا۔ یہ وہی میرؔ ہے جس کا فرمایا ہوا مستند ہے اور جو سارے عالم پر چھایا ہوا ہے۔ غزل کے علاوہ بھی میرؔ نے دیگر اصنافِ شاعری میں بھی طبع آزمائی کی بالخصوص مثنوی کی صنفِ سخن کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔

محمد یار گوندل ''مثنویاتِ میرؔ'' میں رقم طراز ہیں:

> ''میرؔ تقی میرؔ بنیادی طور پر ایک غزل گو شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں بھی روحِ عصر کی جھلکیاں نمایاں نظر آتی ہیں اور ان کی شخصیت کا بھی واضح اظہار ملتا ہے لیکن ان کی شخصیت کا مکمل اظہار ان کی مثنویوں میں ہوتا ہے۔ جہاں میرؔ نے اپنے دل کے سارے نہاں خانے وا کر دیے ہیں۔''(۶)

میرؔ کی مختلف موضوعات پر مشتمل مثنویوں کی تعداد اکتالیس ہے۔ میرؔ کی اولیں عشقیہ مثنوی ''شعلۂ شوق'' ہے جو شعلۂ عشق کے نام سے بھی مشہور ہے لیکن کلیاتِ میرؔ مطبوعہ سنگِ میل پبلشرز میں بھی اس کا نام ''شعلۂ شوق'' ہی درج ہے۔ پیشِ نظر مثنوی کا ماخذ میرؔشمس الدین فقیر دہلوی کی ایک فارسی مثنوی ''تصویرِ محبّت'' ہے۔ مثنوی شعلۂ شوق کے ابتدائی بتیس اشعار میں میرؔ نے عشق کی ماہیت بیان کی ہے۔ ان اشعار کے مطالعہ سے میرؔ کا تصورِ عشق واضح ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

محبّت نے ظلمت سے کاڑھا نور ہے
نہ ہوتی محبّت ، نہ ہوتا ظہور
محبّت مسبب ، محبّت سبب ہے
محبّت سے آتے ہیں کارِ عجب
محبّت ہی اس کارخانے میں ہے
محبّت سے سب کچھ زمانے میں ہے
محبّت کی آتش سے اخگر ہے دل
محبّت نہ ہوئے تو پتّھر ہے دل(۷)

میرؔ نے عشق کے مختلف کارنامے اور واقعات بیان کیے ہیں اور اپنے اشعار کے ذریعے یہ بتایا ہے کہ عشق اور مصائب لازم و ملزوم ہیں۔ میرؔ نے فن کاری سے ایک ایک شعر میں فسانۂ عشق کو بلاغت سے سمو دیا ہے۔ مثلاً:

گیا قیس ناشاد اس عشق میں ہوئی اس سے شیریں کی حالت تباہ
کھپی جانِ فرہاد اس عشق میں کیا اس سے لیلیٰ نے خیمہ سیاہ
سُنا ہو گا وامق پہ جو کچھ ہوا جو عذرا پہ گزرا سو مشہور ہے
نل اس عشق میں کس طرح سے موا دمن کا بھی احوال مذکور ہے(۸)

میرؔ نے ایک ایک مثنوی میں پوری داستانِ عشق بیان کی ہے میرؔ کے نزدیک سورج، چاند وغیرہ میں جو گرمی ہے وہ اسی عشق کی بدولت ہے۔

اس آتش سے گرمی ہے خورشید میں اسی سے دل ماہ ہے داغ دار
یہی ذرّے کی جان نومید میں کتاں کا جگر ہے سراسر فگار(۹)

محبت کی تعریف و توصیف اور افادیت کے بعد اصل قصہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ میرؔ نے باقاعدہ عنوان دیا ہے ''آغازِ قصہ''۔ قصہ کی ابتدا میں میرؔ نے بتایا ہے کہ پٹنہ کا ایک خوش اندام نوجوان پرس رام تھا جس کے حُسن و جمال کی ہر طرف دُھوم تھی۔ پرس رام کا ایک عاشق تھا جو ہر وقت اسے اپنے ساتھ رکھتا تھا جب پرس رام کی شادی ہوئی تو میاں بیوی کی محبّت اتنی بڑھی کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر ایک لمحہ نہیں رہ سکتے تھے۔ ایک دن جب پرس رام اپنے عاشق کے پاس آیا تو پرس رام نے اسے بتایا کہ وہ اپنی بیوی سے بے پناہ محبّت کرتا ہے۔ وہ بھی پرس رام سے شدید محبّت کرتی ہے کہ اگر اسے بُری خبر جھوٹی بھی سُنادے تو وہ جان دے دے۔ یہ سُن کر عاشق نے کہا کہ شاید تو یہ بات بھول گیا ہے کہ عورتوں کا مکر مشہور ہے۔ پھر پرس رام کی بیوی کا امتحان لیا گیا۔ اس کے پاس ایک شخص جھوٹی خبر لایا کہ پرس رام نہاتے ہوئے دریا میں ڈوب کر مر گیا ہے۔ا س کی بیوی نے یہ خبر سُنتے ہی سرد آہ بھری، زمین پر گری اور مر گئی۔ وہ شخص واپس گیا اور پرس رام کو اس سانحہ کی اطلاع دی۔ پرس رام بے خود ہو کر بھاگا ہوا گھر آیا اور اس کے پیکرِ مُردہ کے پاس گر گیا اور بے ساختہ جذباتِ غم کا اظہار کچھ اِس طرح کیا۔

کِیا جلد رختِ سفر تُو نے یار نہ میرؔی سُنی کُچھ نہ اپنی کہی
نہ میرؔا کِیا آہ ٹُک انتظار میرے تیرے دونوں کے جی میں رہی(۱۰)

بیوی کی رحلت کے بعد پرس رام کی بے قراری بڑھ گئی وہ دن رات آہ و زاری کرتا۔ اسی عالمِ جُنُوں میں وُہ ایک شام دریا پر گیا۔ جب رات ہو گئی تو وہیں رُک گیا۔ دریا میں ''شعلۂ سرکش'' نمودار ہوا

اور تڑپ کر بولا:

پکارا کہاں ہے پرس رام تُو
محبّت کا تُک دیکھ انجام تُو (۱۱)

پرس رام یہ آواز سُن کر بے قرار ہو گیا اور کشتی سے اُترا اور پھر اس طرح مخاطب ہوا:

مَیں ہُوں پرس رام خانہ خراب
مرا دل بھی اس آگ سے ہے کباب (۱۲)

شعلہ پرس رام کی طرف بڑھا دونوں گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے:

بہم گرم جوشی سے یک جا ہوئے
کہ گزری تھی مدت بھی تنہا ہوئے(۱۳)

کچھ دیر شعلہ بھڑک کر غائب ہو گیا۔ مثنوی کا اختتام میرؔ نے درج ذیل اشعار پر کیا ہے اسے ''مقولۂ شاعر'' کا عنوان دیاہے کہتے ہیں:

بہت جی جلائے ہیں اس عشق نے — بہت گھر لٹائے ہیں اس عشق نے
فسانوں سے اس کے لبالب ہے دہر — جلائے ہیں اس تندِ آتش نے شہر
محبّت نہ ہو کاش مخلوق کو — نہ چھوڑے یہ عاشق نہ معشوق کو(۱۴)

یہ مثنوی جذبۂ عشق ایک بحرِ بے کراں ہے انتہائی صاف، رواں دواں مثنوی ہے مافوق الفطری عناصر اس مثنوی میں موجود ہیں۔ جب کہ میرؔ کی دیگر مثنویوں میں مافوق الفطری عناصر کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ یہ مثنوی اپنے دل کش اور رواں اسلوب اور پُرلطف قصہ کی بنا پر قارئین کے لیے دل چسپی کی حامل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نقوش کے میرؔ تقی میرؔ نمبر میں لکھتے ہیں:

''اس مثنوی میں نہ صرف جذبات نگاری اثرانگیز ہے بل کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ خود میرؔ کے جذباتِ عشق بھی اس مثنوی کے مزاج میں شامل ہیں۔''(۱۵)

خواجہ احمد فاروقی کا قول ہے:

''میرؔ کی اُفتادِ طبع عشقیہ مثنوی نگاری کے لیے زیادہ موزوں تھی ا س لیے وہ اس میں زیادہ کامیاب ہوئے اور ان کے ''شعلۂ عشق'' پر آج بھی دنیا سر دُھنتی ہے۔''(۱۶)

میرؔ کی دوسری عشقیہ مثنوی ''دریائے عشق'' بھی قارئین میں بہت مقبول ہوئی یہ میرؔ کی نمائندہ مثنوی ہے اس مثنوی کی ابتدا میں بھی میرؔ نے تصورِ عشق پر روشنی ڈالی ہے۔ اور عشق کے اوصاف پر ۳۲ اشعار درج کیے ہیں۔ مثلاً:

عشق ہے تازہ کار ، تازہ خیال — ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
کسو چہرے کا رنگ زرد ہوا — طور پر جا کے شعلہ پیشہ رہا
کسو ، محمل کی رہ کی گرد ہوا — بستیوں میں شرار تیشہ رہا(۱۷)

پیشِ نظر مثنوی میں ایک عاشق مزاج لالہ رخسار جوانِ رعنا کا تعارف کر دیا گیا ہے جو خوش صورتوں سے اُنس رکھتا ہے اور اس وقت کسی محبوب کے نہ ہونے کی وجہ سے بے صبر و بے قرار تھا۔ ایک دن وہ باغ کی سیر کو گیا تو اسے ایک مہ پارہ سے محبّت ہو گئی۔ میرؔ نے اس نوجوان عاشق کے جذبات کی عکاسی عمدہ انداز سے کی ہے۔ جب لڑکی کے گھر والوں کو عشق کا ماجرا معلوم ہوا تو رسوائی کے ڈر سے انھوں نے لڑکی کو دایہ کے ساتھ دریا پار عزیزوں کے ہاں بھیج دیا جب لڑکی محافے میں بیٹھ کر چلی گئی تو عاشقِ زار بھی آہ و زاری کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کرنے لگے۔

جہاں دیدہ دایہ نے یہ باتیں سُنیں تو اس نے نوجوان کو اپنے پاس بلایا۔ اسے تسلی دی اور کہا کہ اب ہجر کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ لڑکی بھی سخت دل تنگ ہے تیرے بغیر اس کا رستہ کٹنا مشکل ہے۔ باتیں کرتے کرتے جب کشتی دریا کے عین بیچ پہنچی تو دایہ نے لڑکی کا جوتا دریا میں پھینک دیا اور کہا کتنے افسوس کی بات ہے کہ تیرے محبوب کی جوتی موجِ دریا سے ہم آغوش ہو تُو اُسے واپس نہ لائے۔ دایہ کی یہ بات سُن کر نوجوان دریا میں کود گیا اور ڈوب کر مر گیا۔ ایک ہفتے بعد لڑکی کا گزر دریا سے ہوا تو اس نے بھی دریا میں کود کر جان دے دی۔ تیراکوں نے کافی تلاش کیا مگر کہیں پتہ نہ چلا۔ گھر والوں نے جال ڈلوائے تو دیکھا وہ نوجوان اور مہ پارہ مردہ حالت میں ایک دوسرے سے پیوست جال میں آ گئے ہیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کہ یہ دونوں ایک قالب ہیں۔ دونوں کو الگ کرنے کی کوشش کی گئی مگر بے سود۔ مثنوی اس المیہ وصل پر ختم ہوئی۔ آخر میں عنوان ''مقولۂ شاعر'' میں میرؔ نے شاعرانہ تعلّی دکھائی ہے۔

کتنی وسعت تیرے بیاں میں ہے
کتنی طاقت تری زباں میں ہے

اس مثنوی کے متعلق نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''یہ مثنوی اتنی مقبول ہوئی کہ غلام ہمدانی مصحفی نے بھی اسی قصے کو اپنی مثنوی ''بحرالمحبت'' میں موضوعِ سخن بنایا..... اور اعتراف کیا..... میرؔ کی اس مثنوی میں جذبۂ عشق کا ایسا بھرپور اظہار ہوا ہے کہ شاعری و فن کے لحاظ سے یہ اردو زبان کی بہترین مثنویوں میں سے ایک ہے۔''(۱۸)

پیشِ نظر مثنوی میں میرؔ کے دور کی تہذیب و ثقافت کا واضح عکس دکھائی دیتا ہے۔ محافے اور دایہ کا ذکر قابلِ غور ہے کہ یہ بھی ایک مخصوص طرزِ معاشرت کی آئینہ داری کرتا ہے۔ پھر لڑکی والوں کا رسوائی کے ڈر سے بہانے تراشنا ایک مہذب کلچر کی پیداوار ہے۔ اس مثنوی میں میرؔ نے مثنوی کی ہیروئن کو مختلف ناموں سے مخاطب کیا ہے مثلاً مہ پارہ، غیرتِ مہ تاباں، جفاپیشہ، تغافل کش، گلِ نو، رشکِ مہ، سراپا ناز، غیرتِ خورشید اور دُرِّنایاب وغیرہ۔ گیان چند جین اس مثنوی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اس مثنوی کی زبان میرؔ کی دوسری عشقیہ مثنویوں کی نسبت کم رواں ہے بعض مصرعوں کی بندش بہت ڈھیلی ہے اسی وجہ سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو گا کہ یہ میرؔ کی ابتدائی مثنویوں میں سے ہے۔ ہاں شدتِ جذبات کے اعتبار سے یہ کسی دوسری مثنوی سے کم نہیں۔''(۱۹)

مثنوی میں معصومیت، درد اور اثر پنہاں ہے مثنوی کا انجام الم ناک ہے۔ بالعموم میرؔ کے ہر قصہ کا اختتام اسی طرح عاشق معشوق کی موت پر ہوتا ہے میرؔ کو جذبہ نگاری میں بھی کمال حاصل ہے یہ تمام کیفیات، جذبات و احساسات شاعر کے ذاتی تجربات معلوم ہوتے ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ درد و اثر کے حامل ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''میرؔ نے عام طور پر عشق کی عالم گیر کارفرمائیوں سے بحث کی ہے۔ ان کی مثنویاں عشق و محبّت کے مرقع ہیں۔ ان کے پلاٹ غیر اہم اور معمولی ہیں۔ اصل چیز وہ پاک اور سچا جذبۂ محبّت ہے جو ہر مثنوی کی فضا پر چھایا ہوا ہے۔''(۲۰)

''دریائے عشق'' میں شاعر نے عشق کی واردات اور دایہ کے قصے کا اضافہ کیا ہے اور اپنے رومانی و المیہ مزاج کی بدولت مثنوی کی ساری فضا کو بدل دیا ہے۔تیسری ''عشقیہ مثنوی'' معاملاتِ عشق ہے۔ یہ مثنوی خود میرؔ صاحب کی داستانِ عشق معلوم ہوتی ہے۔ اس میں تخیل بھی ہے اور مبالغہ بھی۔ لیکن میرؔ کو اپنے عشق میں جو ناکامی ہوئی اس کا واضح عکس اس مثنوی میں موجود ہے۔ مثنوی کے پہلے حصے میں عشق کی تعریف کر کے میرؔ نے پہلے عشق کا مجرد تصور پیش کیا ہے اور پھر اس تصور کو عشق کے خالص مادی تصور سے ملا دیا ہے۔

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق — حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشقِ حق ہے کہیں نبی ہے کہیں — ہے محمد کہیں علیؓ ہے کہیں
عشق عالی جناب رکھتا ہے — جبرئیل و کتاب رکھتا ہے(۲۱)

پیشِ نظر مثنوی میں سات ''معاملات'' بیان کیے گئے ہیں جن سے عشق کی تمام منازل سامنے آتی ہیں جو ہر ایک کو پیش آتی ہیں اور میرؔ صاحب کو بھی پیش آئیں۔ آخری معاملے میں محبوب کے وصل کی خوش خبری سُنائی جاتی ہے۔ زیرِ نظر مثنوی میں محبوب کے حُسن، اس کی نازکی، پنڈلی کی خوب صورتی، محبوب کے وصل و ہجر کی کیفیات کو بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں محبوب کے ناز و انداز اور عاشق کی انفعالیت جو کہ ہماری غزلیہ شاعری کا ایک لازمی جزو ہے اس کو بھی عام فہم انداز میں بیان کیاہے۔ مثنوی کی فضا شگفتگی کی حامل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''تسلسل اور فنی ربط میرؔ کی ساری مثنویوں کی مشترک خصوصیت ہے اور ''معاملاتِ عشق'' میں یہ ربط اتنا گہرا ہے کہ مثنوی کا فنی اثر بڑھ جاتا ہے۔''(۲۲)

اس مثنوی کے دو اشعار درج ذیل ہیں:

برسوں تک پھرا ہوں سرگرداں — روز و شب دونوں تھے مجھے یکساں
نے فقط جان سے جہاں سے گیا — زن و فرزند و خانماں سے گیا

آخری مصرع سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مثنوی کی تصنیف کے وقت میرؔ شادی شدہ بھی تھے اور صاحبِ اولاد بھی تھے۔ یعنی یہ معاشقہ جوشِ عشق اور خواب و خیال کے معاشقے سے مختلف ہے۔ یہ میرؔ کی واحد مثنوی ہے جس کی فضا میں شگفتگی ہے اس میں شوخ محبوب کے دل چسپ معاملات بڑے بے تکلفانہ اور آزادانہ لہجے میں بیان ہوئے ہیں۔ جوشِ عشق میں میرؔ کے اپنے عشق کی روداد اور دِلِ بے تاب کا تذکرہ ملتا ہے بعد ازاں محبوب کی خوب صورتی اور سراپا نگاری کا بیان ملتا ہے۔ ''رخصت شدہ رفتن و بے تاب شدن عاشقِ بے قرار'' کا عنوان دے کر میرؔ نے اپنی بے قراری اور دِل کا کرب بیان کیا ہے۔ پیشِ نظر مثنوی میں اضطراب کی ایسی شدت اور عشق کی بے قراری کا اظہار ملتا ہے یہ مثنوی مہجور عاشق کے جذبات کی تصویر پیش کرتی ہے۔ زیرِ نظر مثنوی میں کوئی کہانی نہیں اور نہ ہی کردار پیش کیے ہیں۔ میرؔ نے ایک عاشق کے دل کی کیفیت بیان کی ہے۔ میرؔ کی اس مثنوی میں رومانی اندازِ نظر ملتا ہے۔ اس مثنوی کے متعلق گیان چند جین ''اردو مثنوی شمالی ہند میں'' میں لکھتے ہیں:

''اس مثنوی میں اسی معاشقے کا ذکر معلوم ہوتا ہے جو ذکرِ میرؔ میں بیان کیا گیا ہے۔ انھیں آگرہ میں کسی سے عشق تھا۔ لیکن ترکِ وطن کرنا پڑا۔ اور اس طرح دیارِ محبوب سے دُور ہو گئے فراق کے عالم میں لکھی اس مثنوی کی فضا بڑی اُداس اور گھٹی گھٹی ہے۔ اس میں سراپائے محبوب اس حُسن سے بیان کیا ہے کہ پڑھتے وقت احساس نہیں ہوتا کہ سراپا بیان کیا جا رہا ہے۔''(۲۳)

یہ واحد مثنوی ہے جس کی ابتدا میرؔ نے حمد نعت اور مناجاتِ عاشقانہ سے کی ہے۔ اس مثنوی میں ایک نوجوان لڑکی پر عاشق ہو جاتا ہے اور آہ و زاری سے ایک دنیا کو سر پر اُٹھا لیتا ہے۔ اتفاق سے ایک درویش کا ادھر سے گزر ہوتا ہے وہ اس کی حالتِ زار پر رحم کھا کر اس کا پیغام محبوبہ تک پہنچاتاہے۔ محبوبہ یہ پیغام سُن کر ناگواری سے کہتی ہے کہ جو عاشق سرِ عام آہ و زاری کرے اس کا مر جانا ہی بہتر ہے۔ درویش واپس آ کر نوجوان کو بتاتا ہے نوجوان غش کھا کر گر جاتا ہے اور اس کی روح پرواز کر جاتی ہے۔ جب یہ خبر نوجوان کی محبوبہ تک پہنچتی ہے تو وہ بھی جان دے دیتی ہے۔ پیشِ نظر مثنوی میں میرؔ نے سراپا نگاری کو بیان کیا ہےمحبوب کے لب و رُخسار، مسکراہٹ، کمر،

چال، ڈھال، محبوب کے دل فریب حُسن کا مبالغہ عروج پر پہنچا ہے۔ زیرِ نظر مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں شیریں فرہاد کا قصہ تھا۔ ''مقولۂ شاعر'' کے ایک شعر سے محولہ بالا بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ یہ مثنوی ''قصۂ شیریں فرہاد'' کا ہی چربہ ہے۔ مثلاً:

سُنا ہے کہ فرہاد پر کیا ہوا
پھر اس عشق نے شیریں سے کیا کیا

پیشِ نظر مثنوی میں میرؔ نے اپنی زندگی کی تصویرکشی کی ہے۔ میرؔ کو جو حالات پیش آئے ان تمام حالات کی عکاسی اس مثنوی میں موجود ہے شاعر کو چاند میں ایک صورت نظر آتی ہے وہ اس کی محبوبہ تھی جو اب ''خواب و خیال'' بن گئی ہے۔ میرؔ کو چاند میں اپنی محبوبہ کی صورت نظر آنے لگی اس کا اظہار درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

نظر رات کو چاند پر جا پڑی — تو گویا کہ بجلی سی دِل پر پڑی
نظر آئی اک شکل مہتاب میں
اگر چند پرتو سے مہ کے ڈروں — کمی آئی جس سے خور و خواب میں
و لیکن نظر اس طرف ہی کروں[۲۴]

پیشِ نظر مثنوی میں میرؔ خود بنیادی کردار کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں اور ان کے عشق کے سچے جذبات کی پُرکیف تصویر ملتی ہے جو قاری کو اپنے سحر میں مبتلا کر دیتی ہے۔ پیشِ نظر مثنوی میں میرؔ کے سوانحی حالات کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ بل کہ حقیقی احساس و جذبہ کے اعتبار سے بھی میرؔ کی بہترین مثنویوں میں شمار ہوئی ہے۔ اس مثنوی میں ہجر سے قبل کے واقعات کا ذکر ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی ہجر سے دوچار ہونے کے بعد لکھی گئی اس لیے اس نظم کی فضا غمگین ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''خواب و خیال میں میرؔ اور زیادہ حقیقت نگاری کرتے ہیں۔اس میں درازیِ ہجر کے بھیانک اور وحشت ناک اثرات کا نقشہ کھینچا ہے اس نظم میں درد کی کسک ہی نہیں دل و جگر کی تڑپ کا بیان ہے۔ سوانح میرؔ میں یہ مثنوی سب سے اہم ہے۔ کیوں کہ اس کے واقعات کی تائید میرؔ کی خودنوشت ذکرِ میرؔ سے بھی ہوتی ہے۔''[۲۵]

''مور نامہ'' میں دو اُمور ایسے بیان ہوئے ہیں جنھیں میرؔ کی ذہنی اُفتاد سے خاص مناسبت ہے۔ ایک تو یہی عشق کی عالم گیر ہنگامہ آرائی یعنی انسان تو کیا چرند پرند بھی عشق میں مبتلا ہیں۔ دوسرے یہ کہ کہانی کا الم ناک انجام جس میں عاشق و معشوق دونوں جان سے جاتے ہیں۔

قصے کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ ایک مور جنگل سے بستی میں آیا یہاں کی رانی حُسن و جمال میں لاثانی تھی۔ مور اس کے دیدار کے لیے شاہی محل پہنچا۔ رانی کا سامنا ہوا تو مور حیرت کی تصویر بن گیا۔ رانی نے اک بے زبان پرندے کو اپنے حُسن کا ایسا گرویدہ پایا تو وہ بھی اسے پیار کرنےلگی اور مور وہیں رانی کے پاس خوشی خوشی رہنے لگا۔ راجا لوگوں کے لگانے بجھانے سے حسد کے انگاروں پر لوٹنے لگا اور مور کی جان کے در پر ہو گیا۔ رانی نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو دل پتھر کر کے مور کو چوری چھپے محل سے نکال دیا راجا کے جاسوس جگہ جگہ مور کی تلاش کرنے لگے۔ رانی بھی اندر ہی اندر گھلنے لگی۔ مور نے جنگل میں جا کر دانہ پانی ترک کر دیا۔ راجا کو مور کے ٹھکانےکا علم ہوا تو وہ خود مور کو ہلاک کرنے کے لیے چلا۔ ادھر اس جگر سوختہ کے سوزِ دروں سے جنگل میں آگ لگ گئی اور سیکڑوں اژدہے شیر جل کر راکھ گئے۔ مور بھی اسی آگ میں جل کر راکھ ہو گیا۔ راجا کو صرف اس کی لاش ملی۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہندوسانی قصوں سے ماخوذاردو مثنویاں میں لکھتے ہیں:

> ''مور در اصل عشق ہے، رانی حُسن ہے اور راجا حسد کی نمائندگی کرتا ہے۔ میرؔ نے حُسن و

عشق کے سوز و ساز اور حسدو رقابت کی آویزش و پیکار کے ازلی افسانے کو ایک نئے پیرائے میں بیان کرتے ہوئے عشق کی اہمیت و عظمت کے اُسی مقدمے کو پھر دہرایا ہے۔ جسے وہ اپنی عشقیہ مثنویوں میں اس سے پہلے بھی کئی بار پیش کر چکے تھے، یعنی کائنات کی بنیادی قوتِ عشق ہے۔ یہاں زمیں سے آسمان تک عشق ہی عشق بھرا ہے۔''(۲۶)

میرؔ نے اس تمثیلی مثنوی میں قارئین کو بتایا ہے کہ عشق فقط انسانوں کی جاگیر نہیں، پرندے بھی اس کے شراروں سے اپنا نشیمن پُھونک سکتے ہیں۔

میرؔ کی ساتویں مثنوی ''عشقیہ'' ہے جب کہ بعض کے نزدیک اس کا نام مثنوی عشقیہ افغانِ پسر ہے کیوں کہ اس مثنوی کا ہیرو ایک افغان پسر ہی ہے۔ مثنوی کی ہیروئن ایک شادی شدہ عورت ہے لیکن افغان پسر اور یہ عورت ایک دوسرے پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ شوہر کی رحلت کے بعد وہ ستی ہوتی ہے تو عاشقِ صادق افغان پسر بھی اس کے بُلانے پر آگ میں کود پڑتا ہے لیکن لوگ اسے نکال لیتے ہیں ابھی وہ جلی ہوئی حالت میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا کہ اس عورت کی روح آتی ہے اور اسے اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اس مثنوی میں مافوق الفطری عنصر بھی شامل ہے جب وہ عورت جل کر خاک ہو جاتی ہے پھر اس کی روح آتی ہے اور تہذیبی رسم کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندو مرد کے مرنے پر اس کی بیوی کو بھی زندہ آگ میں جلا دیتے ہیں۔ اس مثنوی میں ایک عنصر کھٹکتا ہے وہ یہ کہ عورت شادی شدہ ہے اور دوسرے مرد سے محبّت کرنے لگتی ہے یہ بات اخلاقی سطح پر معیوب لگتی ہے۔ یہ عنصر مثنوی کے کلی تاثر کو مجروح کرتا ہے۔

میرؔ کی ایک اور مثنوی ''مثنوی'' ہے۔ اس مثنوی میں پلاٹ، کردار اور قصہ نہیں صرف عشق کا ذکر ہے کہ عشق کیا ہے اور اس کے کارہائے نمایاں کون کون سے ہیں۔ میرؔ کی ایک مثنوی ''مورنامہ'' اس کی کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک مور رانی پر عاشق ہو جاتاہے۔ راجہ کو معلوم ہوتا ہے تو وہ ناراض ہوتا ہے۔ مور رانی کے ایما پر جنگل کا رُخ کرنا ہے راجہ اسے مارنے کے لیے فوج کے ساتھ جنگل پہنچ جاتا ہے راجہ کی فوج پہنچنے سے پہلے مور کی آتشِ عشق سارا جنگل جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ اور تلاشِ بسیار کے بعد مور کا مردہ جسم بادشاہ کے ہاتھ آتا ہے۔ رانی یہ خبر سُن کر جل کر مر جاتی ہے۔ میرؔ نے پیشِ نظر مثنوی میں مور اور رانی کا ہجر میں بے قرار ہونا۔ درختوں کے نام، جنگلوں کی تاریکی کو بیان کیا ہے۔ گیان چند جین لکھتے ہیں:

''اس مثنوی کا قصہ غیر فرضی ہےاس کی زباں اتنی ہی صاف ہے جتنی میرؔ کی دوسری عشقیہ مثنویوں کی..... دوسری عشقیہ مثنویوں کی شدتِ جذبات اس میں بھی اسی قدر ہے جتنی دوسری مثنویں میں۔ مور کو انسان پر عاشق کروا کر میرؔ نے ایک جدت دکھائی۔ لیکن یہ جدت طلسمِ ہوش ربا کے سحر و جادو سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔''(۲۷)

میرؔ کی آخری عشقیہ مثنوی ''مثنوی'' ہے جب کہ بعض کے نزدیک اس کا نام ''مثنوی جوان و عروس'' ہے اور بعض کے نزدیک مثنوی ''حکایتِ عشق'' ہے۔ اس مثنوی میں بھی عشق کی کارفرمائی بیان کی ہے مثنوی میں سراپا نگاری اور جذبات نگاری عمدہ ہے کہانی کا تسلسل بھی موجود ہے۔

میرؔ کی غزل غزل ہونے پر بھی مثنوی کا رنگ رکھتی ہے اور ان کی مثنوی، مثنوی ہونے پر بھی غزل کے انداز کی حامل ہوتی ہے۔ شاید میرؔ مثنوی اور غزل کے درمیانی فاصلوں کو ہٹا کر دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے متمنی تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرؔ مثنوی کو بھی غزل کی طرح شدید شخصی جذبات و احساسات کا ذریعۂ اظہار بنانا چاہتے تھے۔ چناں چہ ان کی مثنویاں خالصتاً شخصی ہیں۔ ان کی مثنویاں میرؔ حسن کی طرح خیال اور افسانوی دنیا کی کہانیاں نہیں بل کہ اپنے ہی غمِ دل کے قصے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی ان کی مثنویاں غزل کی حدود میں پہنچ جاتی ہیں۔ اگرچہ ہم ان کو اصطلاحاً مثنوی ہی کہیں گے غزل نہیں کہہ سکتے۔

مثنویاتِ میرؔ کے قصے اگرچہ عام اور معمولی ہیں مگر پُرالم اور خوفناک ہیں۔ اسی طرح اگرچہ ان کا انجام خوف ناک ہوتا ہے مگر حقیقت اور فطرت کے قریب ہیں گو کہ ان سب حقیقتوں کے باوجود

انوکھے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ لکھتے ہیں:

''ان کی مثنویوں کے قصوں میں دو باتیں نمایاں معلوم ہوتی ہیں ایک خارج کی عام اور معمولی اوصاف و اشیا سے ان کی دل بستگی دوسری داخلی دنیا میں شدید اور غیر متوقع طور پر دل گداز احساسات اور تجربات سے خاص رغبت ، ان سب کی تہ میں سچائی اور خلوص کی لہر برابر چل رہی ہے ان کی مثنویوں میں بھی ان کا طریق کار اور اندازِ فکر و احساس غزل گو شاعر کا ہے.....'' (۲۸)

میرؔ اپنی مثنویوں میں قاری کو ان کے اپنے غم و الم کی جانب متوجہ کرتے ہیں اور قاری کے ساتھ دلی واردات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے کرداروں سے ہم دردی ہوتی ہے ان کی مثنویوں سے تفریح اور مسرت کا عنصر بالکل غائب ہو جاتا ہے اس سے غم کے جذبے کی تطہیر و تسکین نہیں ہوتی بل کہ غم کا جذبہ شدید بن جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرؔ کے ذہن کو المیہ تصورات سے بڑی دلی وابستگی ہے ان کے نزدیک عشق اور ٹریجڈی لازم و ملزوم ہیں ان کی غزلیات میں بھی مارے جانے کا مضمون بکثرت پایا جاتا ہے غزل کے عاشق کا انجام بھی قتل یا ''مرگِ ناگہاں'' کے کچھ نہیں ہے میرؔ کی عشقیہ مثنویوں کے عاشق اور معشوق عشق میں دونوں جان دے دیتے ہیں ان کی مثنویوں ''شعلۂ عشق'' اور ''دریائے عشق'' دونوں کے ہیرو ہیروئن دریا میں ڈوب کر حیاتِ جاوید پا لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان عشقیہ مثنویوں میں پنجاب کے بعض قصوں کا رنگ واضح دکھائی دیتا ہے۔

میرؔ کی مثنویوں کی کہانی بہت سادہ رواں ہیں پلاٹ کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی۔ عشق کا انجام ہمیشہ المیہ ہوتاہے۔ عشق افغان پسر کے علاوہ ہر مثنوی میں پہلے عاشق مرتا ہے اور س کے بعد جذبۂ عشق سے محبوبہ بھی جان دے دیتی ہے۔ ہر مثنوی میں مرنے کے بعد وصل ہوتا ہے اور پھر عاشق و معشوق ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہوجاتے ہیں۔ اس طرح قصہ کا انجام غیر فطری ہو جاتا ہے۔ میرؔ نے جذبِ عشق دکھانے کے لیے اس خلافِ معمول طریقے کا بھی سہارا لیا ہے۔ گیان چند جین لکھتے ہیں:

''ہر مثنوی کا ہیرو اور بیشتر مثنویوں کی نازنین ایک ہی وضع قطع کے ہیں۔ قصے کے کردار مثالی ہیں۔ سب کے ہیرو حسین، عشق پیشہ، درویش منش ہیں۔ سب عشق میں جان دے دینا لڑکوں کا کھیل سمجھتے ہیں۔ ان کی محبوبائیں بھی پیچھے نہیں رہتیں، وہ موت کے دروازے سے گزر کر ان سے جا ملتی ہیں۔''(۲۹)

ان مثنویوں کے کردار ہمارے گرد و پیش دنیا کے باسی نہیں ان کا عشق اس دنیا کا عشق معلوم نہیں ہوتا۔ ان کا تصورِ عشق بہت اعلیٰ اور غزل سے مستعار ہے۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ مثنویاں طویل قطعہ بند غزلیں ہیں۔

یہ مثنویاں فنی معیار پر بھی پورا اُترتی ہیں ان میں جذبات نگاری، سراپا نگاری، جزئیات نگاری کا بیان خوب صورتی سے کیا ہے۔ ان مثنویوں میں تشبیہات و استعارات کا استعمال بھی ملتا ہے۔ بنا بریں ہمیں میرؔ کی مثنویوں میں صنعتِ حُسنِ تعلیل، مراعاۃ النظیر، تضاد، تلمیح اور محاورات کا استعمال بھی ملتا ہے۔الطاف حسین حالی میرؔ کی مثنویوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''میرؔ صاحب کی عمر غزل گوئی میں گزری ہے۔ مثنوی میں بھی بیان کے انتظام اور تسلسل کو انھوں نے کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے اور مطالب کو بڑی خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ جیسا کہ ایک مشاق و ماہر شاعر کر سکتا ہے ..... اگرچہ میرؔ کی مثنویونمیں قصہ پن بہت کم پایا جاتا ہے انھوں نے چند صحیح یا صحیح نما واقعات بطور حکایات کے سیدھے سادے انداز پر بیان کر دیئے ہیں۔''(۳۰)

میرؔ کی مثنویوں کی ہمہ گیری، وسعتِ خیال، مشاہدات و تجربات سے معمور تخلیقی فعالیت ہے جو شاعرانہ بصیرت ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ مثنویاتِ میرؔ میں عصری صداقتوں اور معاشرتی شعور کا گہرا احساس بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ''کلیاتِ میرؔ'' میں لکھتے ہیں:

''یہ مثنویات اپنے موضوعات کے تنوع اور اندازِ بیان کی سادگی اور بے ساختگی کی وجہ سے

مثنوی نگاری کی صنف میں ایک اضافےکی حیثیت رکھتی ہیں۔‘‘(۳۱)

ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

’’اگرچہ میرؔ کی بدولت ہی مثنوی کو شمالی ہندوستان میں ترقی ہوئی۔‘‘

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

’’اُن کی عشقیہ مثنویوں کی زبان ضرور قدیم ہے لیکن اس وقت اس سے بہتر زبان میں مثنوی لکھنا امکان سے باہر تھا۔‘‘(۳۲)

اگرچہ میرؔ کی عمر غزل گوئی میں بسر ہوئی لیکن مثنوی کی دل کشی، روانی اور تسلسل کو بھی انھوں نے قائم اور مطالب کو بھی بڑی خوبی سے بیان کیا۔ میرؔ کی مثنویوں کے بہت سے اشعار زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ مثلاً:

ضبط کروں میں کب تک آہ اب
چل اے خامے بسم اللہ اب

.....

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ
صبر رُخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

.....

رفتہ رفتہ ہوا یوں سودائی
دُور پہنچی ہے میری رسوائی

.....

سنو اے عزیزانِ ذی ہوش و عقل
کہ اس کارواں گہ سے کرنا ہے نقل
پیمبر ہے شہ ہے کہ درویش ہے
سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے

میرؔ کی مثنویوں میں زبان اور موضوع میں مطابقت پائی جاتی ہے۔ میرؔ، سادہ عام فہم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان کی مثنویاں جذبات نگاری اور حقیقت نگاری کی اعلیٰ مثالیں پیش کرتی ہیں۔ امداد امام اثر لکھتے ہیں:’’میرؔ کی مثنویوں میں خارجی مضامین گویا ندارد ہیں۔‘‘(۳۳)

محمد یار گوندل لکھتے ہیں کہ ’’میرؔ کی عشقیہ مثنویوں میں ’’نازک جذبات بڑے لطیف طریقے سے زبان کا جزو بن جاتے ہیں اور مثنوی کی ابیات دھیمے راگ سے لطیف درد کی ایک ایسی فضا قائم کرتے ہیں کہ یہاں فن کے فقدان کے بجائے فن کے کمال کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔‘‘(۳۴)

میرؔ کی عشقیہ مثنویاں جن میں شعلۂ شوق اور دریائے عشق شامل ہیں مکمل مثنوی کا تاثر دیتی ہیں۔ ان کے کردار، پلاٹ، قصہ کافی مربوط ہیں ڈاکٹر آہ سیتاپوری لکھتے ہیں:

’’میرؔ کی مثنویوں کے پلاٹ اچھے خاصے کامیاب پلاٹ کہلانے کے مستحق ہیں۔‘‘(۳۵)

میرؔ کی مثنویوں میں خلوص اور صداقت بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ لکھتے ہیں:

’’میرؔ کی مثنویوں میں خلوص، سچائی اور الم انگیزی کے یہ نقوش نہ ہوتے تو ان کی مثنویوں اور سودا کی مثنویوں میں کچھ فرق نہ ہوتا۔‘‘(۳۶)

محمد یار گوندل ’’مثنویاتِ میرؔ‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’میرؔ کی عشقیہ مثنویاں نہایت صاف، رواں اور آورد سے پاک ہیں ان کے بیان کی سلاست اور روانی سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قصداً کسی چیز کے بیان کا اہتمام نہیں کیا بل کہ بے تکلفانہ جو ذہن سے نکلتا گیا اس کو سپردِ قلم کرتے چلے گئے ۔‘‘(۳۷)

الطاف حسین حالی ’’مقدمہ شعر و شاعری‘‘ لکھتے ہیں:

’’..... مگر جتنی میرؔ کی عشقیہ مثنویاں ہم نے دیکھی ہیں وہ سب نتیجہ خیز اور عام مثنوی کے

برخلاف بے شرمی و بے حیائی باتوں سے مبرا ہیں۔‘‘(۳۸)

حالی نے ان مثنویوں کو اخلاقی پیمانے سے ناپا ہے۔ ان میں ابتذال کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا۔ صرف معاملاتِ عشق کے سراپا میں ذرا عریاں ہوجاتے ہیں۔درحقیقت میرؔ کی تمام مثنویاں نتیجہ خیز ہیں لیکن عشقیہ مثنویوں میں ’’مورنامہ‘‘، ’’حکایتِ عشق‘ اور مثنوی ’’افغان پسر‘‘ میں بے شرمی اور بے حیائی موجود ہے کیوں کہ کتخدائی عورت کا اپنے شوہر کو چھوڑ کر کسی غیر مرد کے ساتھ عشق بے حیائی کے زمرے میں آتا ہے یہ باتیں قاری کے مزاج پر ناگوار گزرتی ہیں۔میرؔ کی مثنویوں پر غزل کا رنگ غالب ہے بل کہ بعض اشعار تو بالکل غزل کے ہی معلوم ہوتے ہیں اور اس سے میرؔ کا مزاج اور رنگِ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

’’مثنوی گوئی میں میرؔ کی شہرت عشقیہ مثنویوں کی وجہ سے ہے۔ یہ شدتِ جذبات اور وارداتِ قلبی کے بہترین مرقعے ہیں۔ میرؔ خارجی حالات کے بیان کرنے میں قاصر نہ تھے۔ چناں چہ ان کی دوسری مثنویوں سے عصری تہذیب اور ماحول کے بارے میں مفید معلومات ہوتی ہیں۔ ان کے سوانح حیات پر روشنی پڑتی ہے۔ میرؔ کی عشقیہ مثنویاں ہمیشہ تازہ رہیں گی اور ہر دور میں دل چسپی سے پڑھی جائیں گی۔‘‘(۳۹)

محولہ بالا مثنویوں میں میرؔ کی اپنی ذات بے نقاب ہوتی ہے۔ ان مثنویوں کے ذریعے میرؔ کے سوانحی حالات اور درون خانۂ دل، دلی واردات میرؔ کی شخصیت کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ میرؔ نے عشقیہ قصے کہانیوں کو اردو مثنوی میں بیان کیا۔ میرؔ تقی میرؔ عشقیہ مثنوی نگار کے طور پر منظر عام پر آتے ہیں۔ ان کے والد صاحب نے جو کہا کہ ’’بیٹا عشق اختیار کرو‘‘ تو ان عشقیہ مثنویوں میں عشق اختیار کرنے، عشق کو پروان چڑھانے، عشقیہ رموز بیان کرنے اور معمولاتِ عشق اورمعاملاتِ عشق کا اظہار ملتا ہے۔ ان مثنویوں سے میرؔ کے فلسفۂ عشق کو بھی بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ ان مثنویوں میں میرؔ بطور عاشق پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان مثنویوں میں خلوص، صداقت اور غم و الم کے نقوش واضح دکھائی دیتے ہیں۔ میرؔ کی مثنویوں کے حوالے سے محمد یار گوندل لکھتے ہیں:

’’بہر حال میرؔ کی مثنوی اردو مثنوی کا مینارۂ نور ہے اور یہ اتنا بلند ہے کہ دورِ جدید میں بھی صنفِ مثنوی میں دور سے دیکھنے پر واضح طور پر نظر آتا ہے۔‘‘(۴۰)

میرؔ کی مثنویوں میں اُن کا لہجہ دردمندی کا ہے۔ ان کے اس لہجے میں محبّت اور مروّت کا انداز نمایاں ہے۔ میرؔ نے اپنے درد میں محبّت، مروّت اور وفا جیسی قدروں کی نایابی کا گلہ کیا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا لہجہ احساسِ مروّت اور احترامِ آدمیت کا آئینہ دار ہے۔ یہ لہجہ محبّت اور انسانیت کو جِلا بخشتا ہے۔ اسی لہجے نے غمِ عشق سے مل کر میرؔ کی مثنویوں کے اشعار میں شعلوں کی سی لپیٹ پیدا کر دی۔میرؔ کی مثنویوں سے کئی برسوں کی روایات، تمدنی وراثت، تاریخی اور تہذیبی عوامل کی جلوہ گری دکھائی دیتی ہے۔

مختصر یہ کہ میرؔ کی عشقیہ مثنویاں خالص عشق کے جذبات سے بھرپور ہیں۔ یہ مثنویاں قارئین کو مسرت کا سامان بہم پہنچاتی ہیں۔ میرؔ نے ان مثنویوں میں اعلیٰ قسم کی تخیلاتی اور ماورائی دنیا کی تصویر پیش کی ہے۔ عشق کی واردات اور عاشق کی حالتِ زار کو نمایاں کر کے پیش کیا ہے۔ یہ میرؔ کی عشقیہ مثنویاں بھی غزلوں کی طرح آج بھی رومانی شعرا اور قارئین کے لیے جہاں مسرت کا سامان بہم پہنچاتی ہیں وہیں یہ عشقیہ مثنویاں قارئین کے لیے مشعلِ راہ بھی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ میرتقی میر، ''**ذکرِ میر (متن فارسی)، میرکی آپ بیتی**'' (اردو ترجمہ)، ترتیب و ترجمہ؛ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، لاہور:مجلسِ ترقیِ ادب، جون ۱۹۹۶، ص۱۷۷۔ ۱۷۸
۲۔ گیان چند جین،''میرؔ کی عشقیہ مثنویاں''، مشمولہ؛ **نقوش** (میرتقی میرنمبر۲) ، شمارہ۱۰، لاہور: ادارۂ فروغِ اردو، نومبر ۱۹۶۴، ص۴۲۳
۳۔ ڈاکٹر جمیل جالبی،''مطالعۂ میرؔ''، مشمولہ؛ **نقوش** (میرتقی میرنمبر۲) ، شمارہ۱۰، ص۴۲۶
۴۔ ایضاً، ص۶۲۸
۵۔ سیّد عبداللہ، **نقدِ میر**،دہلی: جہان گیر بُک ڈپو، سن ندارد، ص۳۰۲
۶۔ محمد یار گوندل، **مثنویاتِ میر**،فیصل آباد:مثال پبلشرز، ۲۰۰۸،ص۳۷
۷۔ میر تقی میر ، **کلیاتِ میر**،لاہور: سنگِ میل پبلشرز، ۱۹۸۷، ص۸۹۰
۸۔ ایضاً، ص۸۹۰
۹۔ ایضاً، ص۸۹۱
۱۰۔ ایضاً، ص۸۹۵
۱۱۔ ایضاً، ص۸۹۸
۱۲۔ ایضاً، ص۸۹۸
۱۳۔ ایضاً، ص۸۹۸
۱۴۔ ایضاً، ص۸۹۹
۱۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی،"مطالعۂ میر"، مشمولہ؛ **نقوش** (میرتقی میرنمبر۲)، شمارہ۱۰، ص۶۱۸
۱۶۔ میرتقی میر، **حیات و شاعری** ،علی گڑھ: انجمنِ ترقیِ اردو ہند، ۱۹۵۴،ص
۱۷۔ ایضاً، ص۹۰۰
۱۸۔ نثار احمد فاروقی (مرتب)، **دہلی کالج میگزین** (میرنمبر)، ۱۹۸۰، ص۳۷۹
۱۹۔ گیان چند جین، ''میرؔ کی عشقیہ مثنویاں''،مشمولہ؛ **نقوش** (میرتقی میرنمبر۲)، شمارہ۱۰، ص۲۳۷
۲۰۔ ایضاً ،ص۳۵۸
۲۱۔ میر تقی میر،**کلیاتِ میر**، ص ۹۰۰
۲۲۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، ''مطالعۂ میر''، مشمولہ؛ **نقوش** (میرتقی میرنمبر۲)، شمارہ۱۰، ص۶۲۱
۲۳۔ گیان چند جین، **اردو مثنوی شمالی ہند میں**(حصہ اول)، دہلی:انجمنِ ترقیِ اردو ہند، ۱۹۸۷، ص۲۱۶
۲۴۔ میر تقی میر،**کلیاتِ میر**،لاہور: سنگِ میل پبلشرز، ۱۹۸۷، ص ۹۶۹
۲۵۔ گیان چند جین،**اردو مثنوی شمالی ہند میں**(حصہ اول) ، ص ۲۱۷
۲۶۔ میر تقی میر،**کلیاتِ میر**، ص۱۴۲
۲۷۔ گیان چند جین،**اردو مثنوی شمالی ہند میں**(حصہ اول) ، ص۲۴۰
۲۸۔ سیّد عبداللہ، **نقدِ میر**، ص۲۹۴
۲۹۔ گیان چند جین،**میرکی عشقیہ مثنویاں**،ص۲۴۱
۳۰۔ الطاف حسین حالی، **مقدمہ شعر و شاعری**،لاہور:کشمیرکتاب گھر اردو بازار ، ۱۹۸
۳۱۔ عبادت بریلوی،ڈاکٹر، "کلیاتِ میر"،مشمولہ ؛ **اردو دنیا**، شمارہ نمبر ۱۱، کراچی: ، ص۴۲
۳۲۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، **میرتقی میرحیات اور شاعری**،نئی دہلی: انجمنِ ترقّیِ اردو ہند، ۲۰۱۵، ص۳۲۴
۳۳۔ امداد علی اثر ، سید،**کاشف الحقائق**(جلد اول)، ص۳۲۸
۳۴۔ محمد یار گوندل، **مثنویاتِ میر**،فیصل آباد:مثال پبلشرز، ۲۰۰۸،ص۱۱۶
۳۵۔ آہ سیتا پوری،ڈاکٹر،**فلسفۂ میر**،لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۱، ص۱۰۰
۳۶۔ عبداللہ،ڈاکٹر سید، **نقدِ میر**، لاہور:آئینۂ ادب، بارِ اوّل، ۱۹۸۵، ص۲۹۶
۳۷۔ محمد یار گوندل، **مثنویاتِ میر**، ص۱۳، ۱۴

۳۸ ۔ الطاف حسین حالی، **مقدمہ شعر و شاعری**، ص۱۹۱
۳۹ ۔ گیان چند جین، **اردو مثنوی شمالی ہند میں**،ص۲۶۴
۴۰۔ محمد یار گوندل، **مثنویاتِ میر**، ص۱۲۴